

بنیش فاطمہ
پی ایچ۔ ڈی اسکالر
نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مکاتیب غالب کا اسلوبیاتی جائزہ

In the evolution of letter-writing in Urdu, a lot of writers played their vital role. They introduced new literary conscious in letter writing and made unique position in literature but no one could be able to follow the style, simplicity, effectiveness, charm and the linguistic approach of Mirza Ghalib. He has depicted the emotions in such an authentic manner that They never look like letters but an autobiography. He was an innovative artist and due to his unique expression he reached the height of vision. In Urdu letter writing the method created by Ghalib introduced new dimensions and he dealt with them so authentically that no one is the competitor of Ghalib. Not only he was a great poet but at the same time he was a genuine prose writer. He set a new tradition in our literary history and affected the literary conscious as an important factor which arose under different political, social and intellectual aspects. In Urdu poetry and literature these distinctive features which came with Ghalib can still be traced and this is the milestone of the new literary movements.

اردو مکتوب نگاری کے ارتقاء میں بہت سے ادباء کا حصہ ہے۔ انہوں نے خط نویسی کو نئے تقاضوں اور نئے ادبی شعور سے ہم آہنگ کیا اور ادب میں اپنے لیے ایک الگ مقام بنالیا۔ مگر غالب کا طرزِ تحریر، اس کی سادگی اور پرکاری، اس کی جاذبیت، دلکشی اور اثر انگیزی کو اب تک کوئی اپنا نہیں سکا۔ انہوں نے جذبات کی عکاسی ایسے بہترین پیرائے میں کی ہے کہ وہ خطوط نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان کی خود نوشت معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ایک جدت پسند فنکار تھے۔ یہ انا کا شدید احساس اور جدت پسندی کا تقاضا ہی تھا جو انہیں تقلید سے اجتناب کی طرف لے آیا اور پھر وہ فکر و فن کی اُن اچھوتی فضاؤں تک جا پہنچے جہاں عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ غالب نے بلاشبہ ہماری ادبی تاریخ میں ایک

نئی روایت ہی کی ابتدا نہیں کی بلکہ اپنے بعد کے دور میں مختلف سیاسی، سماجی اور فکری اثرات کے ماتحت تربیت پانے والے ادبی شعور کو بھی ایک بڑے اہم عنصر کی حیثیت سے متاثر کیا ہے اور اگرچہ آج یہ شعور مختلف رنگ بدلتا ہوا کیا سے کیا ہو گیا ہے، مگر وہ امتیازی خصوصیات جو اردو شعر و ادب میں غالب کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی تھیں آج بھی کسی نہ کسی رنگ میں قائم ہیں بلکہ نئی سے نئی ادبی تحریکات کی پشت پناہ ہیں۔ مرزا جتنے بڑے شاعر تھے اُتنے ہی اعلیٰ پایہ کے نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے اردو نثر کو پہلی مرتبہ نثر کے طور پر پیش کیا کیونکہ نثر کا اصل کام موجود اور معلوم مواد کا بے تکلف ابلاغ ہے۔ اُنکی فارسی انشاء پر دازی عنفوانِ شباب سے شروع ہوئی جبکہ اُنکی عمر اٹھائیس برس کی تھی اور بعد میں چالیس برس تک جاری رہی۔ آخر کار دُرُفیش کا ویانی، کی اشاعت اور اردو خطوط نویسی کے آغاز کے بعد غالب نے فارسی میں لکھنا ترک کر دیا۔ ان کے خطوط کے مجموعوں کی ترتیب درج ذیل ہے:

- ۱۔ عودِ ہندی: رقتاتِ غالب کا پہلا مجموعہ غالب کی زندگی میں وفات سے چار ماہ قبل اکتوبر ۱۸۶۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اس میں ۱۶۲ رقتات ہیں۔ اس کے علاوہ غالب کی لکھی ہوئی دو کتابوں کی تقریظیں اور تین کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔
- ۲۔ اردوئے معلیٰ (حصہ اول): دوسرا مجموعہ خطوط، غالب کی وفات کے ۱۹ روز بعد ۶ مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۴۶۴ صفحات اور ۲۷۲ خطوط ہیں۔

اردوئے معلیٰ (حصہ دوم): ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس حصے میں خاص کر وہ رقتات شامل ہیں جن میں غالب نے لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں یا شاعری سے متعلق کوئی ہدایت کی ہے یا کوئی نکتہ بتایا ہے اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریوز بھی ہیں۔ اس میں ۵۶ صفحات اور ۵۳ رقعے ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں اردوئے معلیٰ کے دونوں حصے یکجا شائع کیے گئے اور آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کر دیا گیا جس میں غیر مطبوعہ ۲۳ خطوط شامل ہیں۔

- ۳۔ مکاتیبِ غالب: یہ آخری مجموعہ خطوط ہے جس میں نواب یوسف علی خان بہادر اور نواب کلب علی خان بہادر کے نام غالب کے ۱۱۵ مکتوبات ہیں۔ یہ مجموعہ نہایت خوبصورت ٹائپ میں بہترین طباعت کے ساتھ ریاست کی جانب سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے۔
- مرزا غالب فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اسی لیے اردو نثر کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ سب سے پہلے اردو نثر میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کے خطوط تھے۔ دراصل مکتوب نگاری غالب کے مزاج کا جزوِ لاینفک معلوم ہوتی ہے جس کی اہمیت کا اظہار اُن کے کلام میں بھی جا بجا ہوا ہے:

یہ جانتا ہوں کہ تُو اور پانچ مکتوب

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

یہ ذوقِ خامہ فرسائی، خطوطِ غالب کی فنی قدر و منزلت کا جائزہ لینے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو نثر نے اس دور میں ترقی کی دو منازل طے کیں، ایک وِجہی سے فورٹ ولیم کالج تک، دوسری فورٹ ولیم کالج سے غالب تک۔ مرزا غالب کے خطوط سے عَرِ اردو کی تیسری منزل شروع ہوتی ہے۔ جب انہوں نے اردو میں مکتوب نگاری شروع کی تو ان کے سامنے نثر نگاری کے دو انداز موجود تھے، ایک وہ

پُر تکلف انداز جو فارسی انشاء پردازی کے نتیجے میں اردو میں رواج پا چکا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ نثر میں شاعرانہ وسائل اور دوشنہ نے اس دور میں ترقی کی دو منازل طے کیں، ایک وہجی سے فورٹ ولیم کالج تک، دوسری فورٹ ولیم کالج سے غالب تک۔ مرزا غالب کے خطوط سے بجز اردو کی تیسری منزل شروع ہوتی ہے۔ جب انہوں نے اردو میں مکتوب نگاری شروع کی تو ان کے سامنے نثر نگاری کے دو انداز موجود تھے، ایک وہ پر تکلف انداز جو فارسی انشاء پردازی کے نتیجے میں اردو میں رواج پا چکا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ نثر میں شاعرانہ وسائل اور طریقوں سے کام لینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ فقرے عموماً مقفے ہوتے تھے، صنائع و بدائع کا استعمال بکثرت کیا جاتا تھا۔ اس قسم کی نثر میں مدعا اور مضمون کو ثانوی حیثیت دی جاتی تھی اور عبارت کی آرائش و زیبائش کو اصل مقصود خیال کیا جاتا تھا۔ اردو کے اولین نثر نگاروں کے سامنے اسی طرز کے نمونے موجود تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج سے پہلے کے اردو کے دو بڑے نثری کارنامے ’سب رس‘ (ملا وہجی) اور ’نورِ مرصع‘ (تحسین) اسی طرز انشاء کے حامل ہیں۔

اردو نثر کی ترقی کی دوسری تحریک فورٹ ولیم کالج کے اصول میں پیدا ہوئی، جس کی سب سے بڑی خوبی سادگی و سلاست ہے۔ اس تحریک کے تحت لکھنے والوں نے اظہارِ خیال کے بنے ہوئے ’سانچوں‘ کی بجائے عام بول چال کی زبان کو اپنی تحریروں میں جگہ دے کر ادب کو ایک عام قاری کے لیے سہل الحصول تو بنادیا مگر اپنے زمانے کی زندگی کی عکاسی نہیں کی۔ انہوں نے نثر نگاری کا جو طریقہ اختیار کیا اس میں کسی حد تک بے ضرورت فارسی اور عربی تراکیب کے بوجھ سے اپنی نثر کو آزاد کر لیا مگر انکی تحریریں فارسی سے کلیہً خالی نہیں۔ وہ کسی حد تک صنائع کا استعمال بھی کرتے ہیں اور مسجع نگاری (یعنی قافیہ بندی) اُن سب کی نثر میں خصوصاً میرا سن کے ہاں بکثرت موجود ہے۔

حامد حسن رضوی ’نثرِ داستانِ اردو‘ میں لکھتے ہیں:

”بجز اردو میں غالب کی اولیت ان کے رفعات کے سبب سے ہے۔“

اردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اور اس میں جو جدتیں

پیدا کیں اور ان کو جو التزام، اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا، اس میں

غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی۔“ (۱)

اب تک اردو خطوط کی روشنی میں ان کی خط نویسی کا آغاز مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب اردو نثر پر کٹکٹ اور تنبذ کا یہ عالم طاری تھا کہ دفعتاً مرزا غالب نے فارسی کی بجائے اردو کو خطوط نویسی کا ذریعہ بناتے ہوئے اس کو ایک زندہ عظیم الشان اسلوب سے روشناس کرایا۔ یہ وہ اسلوب ہے جس میں قدیم پر تکلف انداز اور کلکتہ کی نثری تحریک کے بیشتر محاسن مجتمع ہو گئے ہیں اور جس میں الفاظ اور معانی اس طرح باہم یک جان ہو گئے ہیں جس طرح پھول میں مختلف رنگ مجتمع۔ غالب کی اردو نثر کا سارا سرمایہ اُن کے مکاتیب میں ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اسلوب کو شخصیت کا آئینہ دار بنایا۔ ان کی شاعری سے ان کی شخصیت کے سب گوشے ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ ان کی شاعری نے ہمارے دلوں میں ان کی عظمت کا احساس پیدا کیا ہے۔ ہر چند کہ ان کی شاعری مستظلاً عظمت اور بڑائی پر کھڑی ہے مگر اس کے مقبول تر بنانے میں ان کے مکاتیب نے بھی بہت بڑا حصہ لیا ہے کیونکہ ان مکاتیب کے ذریعے ہم اپنے ادبی ہیرو کو ایک انسان کی حیثیت سے بھی

دیکھ سکتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ فارسی خط نویسی میں کمی اور اردو خطوط میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس امر میں خود غالب کے بیانات زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ ان کے بیانات میں اردو خطوط نویسی کی ابتدا کے علاوہ فارسی زبان میں دقتوں اور اردو میں اظہار کی سہولتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور جب یہ باتیں غالب جیسا فارسی پر ناز کرنے والا شخص کہتا ہے تو اس سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ اکتسابی زبان بہر حال اکتسابی ہی ہوتی ہے۔ اس میں انسان خواہ کتنی ہی مہارت کیوں نہ حاصل کر لے، اسے فطری اور بلا تکلف طریق اظہار کا درجہ مشکل سے حاصل ہو سکتا ہے۔ غالب کے وہ خطوط جن میں انہوں نے فارسی خطوط لکھنے کے بارے میں معذوری کا اظہار اور پھر اسکی وجوہات بیان کی ہیں۔ عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر ضعف و ناتوانی کا احساس اور فارسی میں انشاء پر دازی کا معیار قائم رکھنے کے لیے کافی جانفشانی اور جگر کا دی۔ یہ وہ بنیادی اسباب تھے جو غالب کو سادہ اردو خطوط نویسی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

”افسوس کہ میرا حال اور یہ لیل و نہار آپ کی نظر میں نہیں، ورنہ آپ جانیں کہ اس بجھے ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل اور اس مرے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔ نواب صاحب! اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں زور۔ سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے، بے تامل اور بے فکر جو خیال میں آجائے وہ لکھ لوں، ورنہ فکر کی صعوبت کا تحمل نہیں ہو سکتا۔“ (۲)

غالب کے قوی مضمل ہو چکے تھے، لیکن ان کے دماغ کی آگ روشن تھی بلکہ کائنات کے شعور اور ذات کی آگہی نے اس آگ کو روشن کر دیا تھا، تجربات اور مشاہدات نے فکر میں زیادہ پختگی و بالیدگی، احساس میں زیادہ گہرائی اور گیرائی اور جذبات میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ غالب نے اردو میں خطوط ضرورتاً لکھنا شروع کیے تھے لیکن خطوط نویسی میں اظہار کے امکانات نے بہت جلد ان کے اندر چھپے ہوئے فنکار کو جگایا جو ردیف و قافیہ کی مشقت سے تھک گیا تھا۔ ان کے خطوط کی نثر میں صرف منطقی استدلال ہی نہیں بلکہ اس میں ٹھہرا ہوا جذبہ اور ایک منفرد طرز احساس ہے۔ ان خطوط میں غالب کی تخلیقی صلاحیت، اور نثر کے ہم آہنگ متوازن شاعرانہ مناعی بھرپور امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں تجربات اور احساسات کی رنگارنگی ہے، اجتماعی تجربے بھی ہیں اور ذاتی وارداتیں بھی۔ ایک فرد کی آواز بھی ہے اور پورے عہد کی گونج بھی۔ خطوط غالب اس عہد کے ہندوستان میں رونما ہونے والی اہم ترین سیاسی، سماجی اور تہذیبی، فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا رد عمل بھی ہیں اور ایک فرد کی مایوسیوں اور نا کامیوں کی داستان بھی۔ غرض انسان کی روزمرہ زندگی اور اس کے مسائل کی گونج بھرپور انداز میں اور اردو نثر میں پہلی بار خطوط غالب میں سنائی دیتی ہے۔

اسلوب زبان کے اس غیر روایتی اور غیر رسمی استعمال کا نام ہے جو زبان کے عام اور مخصوص معیار سے مختلف ہو۔ اسلوب تحریر میں بھی ہوتا ہے اور تقریر میں بھی۔ اور دونوں کی خصوصیات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ گفتگو میں قواعد زبان اور صرف و نحو کی پابندی اس طرح نہیں کی جاتی جس طرح تحریر میں کی جاتی ہے۔ گفتگو میں عام طور پر فقرات کی صرفی و نحوی ساخت بہت زیادہ بدل جاتی ہے کیونکہ بولنے والا آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بھی اپنے مقاصد پورے کر لیتا ہے، گفتگو میں جملے چھوٹے

چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور ان میں صیغہ امر، استفہامیہ اور ندائیہ الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تحریری اسلوب میں عام طور پر طویل توضیحی اور مرکب جملے ہوتے ہیں۔ مکتوب نگاری تحریر اور تقریر کے درمیان کی چیز ہے۔

مکتوب نگاری غالب کو اتنی پسند تھی کہ بقول ان کے بیشتر وقت خط لکھنے اور پڑھنے میں صرف ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں سے رابطہ بنارہتا اور ذہنی مشقت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ ان خطوط میں غالب کو ایک وسیع میدان مل گیا تھا۔ ایسا میدان جس میں غالب اپنی شعری صلاحیتوں کا اظہار کر کے نثر میں جادو جگا سکتے تھے۔ روزمرہ کے مسائل پر گفتگو کر سکتے تھے۔ سیاسی و سماجی حالات کا تبصرہ کر سکتے تھے اور موقع کشتی و کردار نگاری کے فن کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ غالب کے فنی و ادبی محاسن کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ غالب خط کو خط سمجھ کر ہی لکھ رہے تھے، اسے داستان، آپ بیتی، انشائیہ، افسانہ یا ڈراما سمجھ کر نہیں لکھ رہے تھے۔ ان کی نثر کا اسلوب بھی شاعری کے اسلوب کی طرح منفرد ہے۔ ان کے تجربات ایک انفرادی شان رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے ہاں نادر اور منفرد تشبیہات استعارات اور تراکیب ملتی ہیں۔ انہوں نے اسلوب کی مروجہ عام پسند اور پیش پا افتادہ صنعتوں سے کام نہیں لیا بلکہ ان کے انداز بیان میں جو تازگی اور نیا پن ہے وہ اس کی انفرادیت کا عکس ہے۔ غالب نے خطوں میں لفظی ہیر پھیر سے جو لطف انگیزی کی ہے اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً ایہام، ایہام تناسب، استعارہ، تشبیہات، استفادہ، تمثیل بالاستفادہ، مبالغہ، صنعت تجنیس، صنعت عکس اور صنعت تضاد، بیشتر انہی صنائع کے استعمال سے وہ لطف اور دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

اس کی وضاحت کے لیے چند مثالیں درج ذیل ہیں:

غالب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی سے بڑی بات کہنے پر قادر ہیں۔ نثر کی سادگی کا حسن ان کے ہاں کھر کر سامنے آیا ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ مخاطب کے دلنشین ہو جاتی ہے، مختصر جملوں کی ساخت سے اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً:

۱۔ ”کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔“ (۳)

۲۔ ”اگر زندگی ہے اور مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔“ (۴)

۳۔ ”میری جان یہ وہ دلی نہیں جہاں تم پیدا ہوئے تھے۔“ (۵)

غالب کے چھوٹے جملے عام طور پر چار لفظوں سے لے کر سات لفظوں تک کے ہوتے ہیں۔ وہ جملہ طویل ہوتا ہے جس میں وضاحت کے طور پر فقرے شامل ہوں۔ غالب کی نثر میں کئی مقامات پر مسجع و مقفی طرز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ مگر وہ اس معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ انہیں چونکہ نظم اور نثر دونوں میں اظہار پر پوری قدرت حاصل ہے، اس لیے وہ اپنے ذہن کی باگ ڈور کبھی الفاظ کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ ان کے ایسے اردو خطوط کی تعداد بہت کم ہے جو پورے کے پورے مقفی ہوں۔ مثلاً گلزارِ سرور، مصنفہ مرزا جب علی بیگ سرور کی تقریظ:

”مجھ کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان کی خوبی میں ’فسانہ عجائب‘ بے نظیر ہے، جس نے

میرے دعوے کو اور زفسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے۔ کیا ہوا کہ ایک طرح اور نقاش کے ہیں، یہ دونوں دلکش و دل فریب ایک ہی نقاش کے ہیں۔ مانا کہ ایک دوسرے کا ثانی ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاٹانی ہے۔ مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعویٰ پیسیری کرے، کیا عقل کی کم ہے۔ یہ بندہ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعوے خدائی نہ کرے، کس حوصلے کا آدمی ہے۔“ (۶)

غالب عام طور پر سادہ نثر لکھتے لکھتے دو فقروں کو مقفی کر دیتے ہیں۔ یہ فقرے شعوری کوشش سے نہیں بلکہ بے ساختہ اور برجستہ قلم سے نکل جاتے ہیں۔ اسی لیے ان فقروں سے عبارت زیادہ یا معنی اور زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے۔ مثلاً (بنام مرزا تقیہ، ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء)

”میرا حال بہ دستور ہے۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔“ (۷)

غالب نے اپنے خطوط میں تشبیہات کا استعمال بہت ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے مثلاً: (بنام مرزا ہرگوپال تقیہ)

”اب اگرچہ تندرست ہوں، لیکن ناتوان و سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا۔ حافظے کو رو بیٹھا، اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قد آدم دیوار اٹھے۔“ (۸)

(بنام سرفراز حسین):

”تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوائے پیرہن کے ساتھ کیا تھا۔“ (۹)

غالب کی اردو نثر میں استعاروں کا برجستہ استعمال ملتا ہے۔ وہ استعارے کی مدد سے پورا واقعہ اور اس سے متعلق اپنی ذہنی و جذباتی کیفیت بھی بیان کر دیتے ہیں۔ ان استعاروں سے ان کی نثر میں اختصار پیدا ہو جاتا ہے اور اس تفصیل کی جانب بھی پڑھنے والے کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے، جو غالب بیان کرنا چاہتے ہیں۔ نواب انور الدولہ شفیق کو لکھتے ہیں:

”تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مددے سکتا ہوں۔ اللہ، اللہ، اللہ

دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔“ (۱۰)

(۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء)

زندگی کے لیے ”دریا“ کا استعارہ کیا خوب ہے۔ اس سے ان کی بات میں جدت بھی پیدا ہو گئی ہے اور ایجاز بھی۔ آخری عمر میں غالب بیماری اور ضعف سے تنگ آ گئے تھے۔ اپنے خطوں میں بار بار انہوں نے موت کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔ اس عبارت میں اپنی اس دلی تمنا کا اظہار ”دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار“ کہہ کر کیسے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

” ۸ رجب ۱۲۲۵ھ کو مجھ کو رو بکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوئم صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے

پاؤں ڈال دی۔ دلی شہر کو زنداں تصور کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔“ (۱۱)

اس اقتباس میں انہوں نے خود کو قیدی قرار دیا ہے۔ پھر استعارے کے لیے ان تمام حالتوں کا ذکر تمثیلاً کیا ہے جن سے ایک قیدی کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس میں لطف کی بناء استعارہ اور تمثیل پر ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں روزمرہ محاوروں کا استعمال بھی کیا۔ جس کی وجہ سے ان کے نثری اسلوب میں گفتگی، سلاست اور بے تکلفی پیدا ہو گئی ہے بلکہ اس کی معنویت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی اردو نثر میں محاورے یا کہاوت کا استعمال ہمیشہ برجستہ اور بے ساختہ کیا ہے۔ مثلاً علاء الدین خان علانی کو لکھتے ہیں:

”لیکن ان ملاؤں اور عزائم خانوں نے تہہ توڑ دی ہے۔ کچھ نہیں جانتے باتیں بکھانتے ہیں۔“ (۱۲)

خطوط غالب میں استعمال کیے گئے کچھ محاوروں کی مثال اس طرح ہے: چھاتی پر سانپ پھر جانا، آنکھ پھوٹنا، ہاتھ دھو بیٹھنا، جان کے لالے پڑنا، جہاں کو سر پر اٹھانا وغیرہ۔ اس کے علاوہ کہاوتوں کا استعمال نہ صرف خطوط نوپسی میں دلچسپی کا اضافہ کرتے ہیں بلکہ اسلوب میں بھی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

مراست میں اشعار کا استعمال ہمارے ہاں ایک عام رواج رہا ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں فارسی اشعار کے ساتھ ساتھ اردو اشعار کا بھی استعمال کیا ہے۔ اس سے خطوط کی ادبی شان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اردو اشعار کے استعمال سے تحریر میں مزید لطف پیدا ہوتا ہے۔ خطوط غالب میں ایسے اشعار موجود ہیں جو انہوں نے مکتوب الیہ کو بحیثیت شاعر نہیں بلکہ بحیثیت مکتوب نگار ارسال کیے ہیں۔ انہوں نے بحیثیت مکتوب نگار ادائے مطلب یا حسن بیان میں اثر پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ وہ جزو عبارت بن گئے ہیں۔ مثلاً میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”قرۃ العینین میر مہدی مجروح و میر سرفراز حسین مجھ سے ناخوش و فکر مند ہوں

گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھتا۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں کاش پوچھو کہ ماجرہ کیا ہے“ (۱۳)

دیوان غالب میں یہ شعر اس طرح ہے:

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

غالب کے بیشتر خطوط تقریر اور تحریر کے درمیان کی چیز ہیں۔ ندائے الفاظ، وصفیہ (یعنی اشیاء، اشخاص اور مناظر کے اوصاف) میں وہ اپنے موضوع کی ٹھوس اور معروضی جزئیات کا خیال رکھتے ہیں۔ ایسے مواقع پر وہ خیال کو دخل دینے کا بہت کم موقع دیتے ہیں۔ بیانیہ (واقعات کے بیان میں) واقعات کی رفتار ہموار رہتی ہے اور رکاوٹ بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی نثر میں غالب جزئیات سے بہت کام لیتے ہیں اور اس معاملے میں آنے والے ناول نگاروں کی پیش روی کرتے ہیں۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قدیم داستانیں پڑھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

”مولانا غالب علیہ رحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں، پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان اور اس قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی ہاتھ آگئی ہے۔ سترہ توئیں بادۂ ناب کی موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔“ (۱۳)

مرزا غالب نے نثر نگاری کے لیے جو نوع منتخب کی (یعنی مکتوب نویسی) اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان کی تحریر زبانی گفتگو کی قائم مقام بن جائے۔ ان کے مکاتیب کے مطالب بھی عموماً ایسے ہیں جن میں بول چال کی زبان ہی موزوں اور مناسب ذریعہ اظہار بن سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی مکتوب نویسی کی غرض و غایت بھی یہی تھی کہ مراسلہ مکالمہ بن جائے اور ہجر میں وصال کے مزے ہوں چنانچہ تفتہ کو لکھتے ہیں: ”بھائی! تم میں مجھ میں نامہ نگاری کا ہے کوہے، مکالمہ ہے۔“ (۱۵)

غالب نے اپنے خطوں کو سچ مچ بات چیت اور مکالمہ بنا دیا تھا۔ یہ چیز ان کے طرزِ مخاطب ان کے استفہامیہ جملوں، ان کے ضمائر اور اشارات اور ان کے دیگر پیرایہ ہائے اظہار سے اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ اس غرض کے لیے وہ بعض اوقات حروف اور تضادات کو ترک کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ سامنے کی گفتگو میں عموماً اعضائے جسمانی کی حرکات و سکنات حروف و الفاظ کی جگہ لے لیتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں گفتگو کا قدرتی آہنگ موجود ہے۔ ان کے خطوں میں جذبات کے مطابق اتار چڑھاؤ، جوش اور ہموار مد و جزر پایا جاتا ہے۔ غم اور خوشی، چچان اور سکون، غرض مختلف جذباتی حالتوں کے مطابق ان کی نثر اپنا آہنگ بدلتی ہے۔ ان کی نثر زندہ ہے، ان کی تحریروں میں زندگی اور جان ہے۔

مثلاً نواب کلب علی خاں بہادر کو لکھتے ہیں:

”پیر و مرشد! حضرت فردوس مکاں (نواب یوسف علی خاں) کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے، مگر کہے بغیر نہیں بنتی، دوسو پچاس کی ہنڈی اس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی۔۔۔ یہ رسم بری نہیں ہے، اگر جاری رہے تو بہتر ہے۔“ (۱۶)

غالب نے خط نویسی کے قدیم انداز کو، جسے وہ ”محمد شاہی روشیں“ کہہ کر پکارتے ہیں، یکسر بدل دیا۔ اس تبدیلی کا احساس خطوط غالب کے آغاز میں القاب و آداب کے استعمال ہی سے ہو جاتا ہے۔ غالب اس بارے میں انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

”پیر و مرشد! یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔“ (۱۷)

مکتوب نگاری کا جو نیا انداز غالب نے اپنایا تھا، اس میں رسمی القاب و آداب کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ تاہم غالب نے فرق مراتب کو ہر حال میں ملحوظ خاطر رکھا۔ اس کا اندازہ مختلف مکتوب الیہان کے نام خطوط سے ہو جاتا ہے۔ القاب میں بے تکلفی اور ندرت وہیں تک ہے جہاں

مراسم کی نوعیت اسکی اجازت دیتی ہے۔ جہاں ادب و احترام واجب ہوتا ہے، وہاں القاب میں کلمات احترام آجاتے ہیں۔ مثلاً غلام غوث خان بے خبر کے نام خطوط میں: پیر و مرشد، قبلہ، قبلہ حاجات، جناب عالی، حضور، بندہ پرور وغیرہ۔ نواب امین الدین احمد خان کے لیے: برادر صاحب جمیل المناقب عیم الاحسان وغیرہ جیسے القاب استعمال کرتے ہیں۔ اب ذرا بے تکلف احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں القاب کی جدت و ندرت ملاحظہ کیجئے:

علاؤ الدین خان علائی:

”مرزا نسیمی کو دعا پہنچے، صاحب، مولانا نسیمی، میری جان، علائی ہمہ دان،

جان غالب، علائی مولائی، مرزا علائی، یار سچیتے گویا بھائی، مولانا علائی،

خدا کی دہائی، میاں، اقبال نشانا، جانا، عالی شان، جان جانا، اے میری

جان، اجی مولانا علائی۔۔۔۔۔“ (۱۸)

بے شک غالب قدیم داستانوں میں دلچسپی رکھتے تھے مگر ان کی وصف نگاری قدیم داستانوں کی طرح فرضی اور خیالی نہیں ہے۔ وہ جزئیات کے ذریعے اپنی وصف نگاری کو زیادہ سے زیادہ یقینی اور قطعی بناتے ہیں۔ چنانچہ موقع کی تصویر کشی کرتے وقت مخاطب کو اپنے ماحول کا پورا پورا احساس دلاتے ہیں۔ خط لکھنے کا وقت بتاتے ہیں اور اپنی اس وقت کی حالت اور مقام وغیرہ کا احساس دلاتے ہیں۔

”آج شنبہ ۲۱ جنوری یہاں مقام ہے۔ نونج گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔“ (۱۹)

”دھوپ میں بیٹھا ہوں، یوسف علی خاں ولالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے، خط لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا۔“ (۲۰)

انہیں جزئیات اور تفصیلات سے جو دلچسپی تھی اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ بیان میں پوری پوری قطعیت پیدا ہو جائے اور مکتوب نگار کی ذات اور ماحول سے مخاطب کی دلچسپی اور بھی بڑھ جائے۔ غالب نے اپنے خطوط میں صنعت تجنیس کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً

”مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکانات گر گئے ہیں۔ سینکڑوں آدمی جا بجا دبا کر مر گئے ہیں۔

گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر کہ وہ ان کال تھا کہ پانی نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا، یہ پن کال

ہے، پانی ایسا برسا کہ بوئے دانے بہہ گئے، جنہوں نے انہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔“ (۲۱)

اس میں بھی ان کال اور پن کال کی صوتی مماثلت موجود ہے۔ اس کے علاوہ لفظی تصویروں میں تقابل و تضاد بھی ہے۔

غالب نے فارسی لفظوں اور تراکیب کا استعمال ایسی برجستگی کے ساتھ کیا ہے کہ ان سے نثر زیادہ مؤثر اور زیادہ معنی خیز ہو گئی ہے۔

بعض اوقات وہ فارسی کی پوری ترکیب استعمال کرتے ہیں مثلاً ”ایک مژہ برہم زون“، ”آفتاب سر کوہ“، ”جگر خوں کن“، ”شمر ہائے پیش رس“ اور ”دلیل مودت روحانی“ وغیرہ۔

غالب کے انگریزوں سے بہت گہرے مراسم تھے۔ انگریزوں میں غالب کے معتقد، دوست، مداح اور ممدوح، سب ہی طرح کے

لوگ تھے۔ پنشن کے مقدمے کی وجہ سے زندگی بھر غالب کی برطانوی حکومت سے مراسلت رہی۔ ان خطوط کا مسودہ عام طور پر غالب فارسی

میں لکھتے اور انگریزی میں ترجمہ کرا کے بھیجتے۔ غالب نے فارسی اور اردو نثر دونوں میں خاصی بڑی تعداد میں انگریزی الفاظ اور بعض انگریزی الفاظ کے اردو ترجموں کا بے تکلف استعمال کیا ہے۔ مثلاً لارڈ (Lord)، گورنمنٹ (Government)، سکرٹری (Secretary)، لیکور (Liquor)، برگڈیر (Brigadier)، پنشن (Pension)، کمپ (Camp)، ایگریمنٹ (Agreement) اور بارک (Barrack) وغیرہ۔

غالب خط لکھتے وقت نہ صرف اپنے لیے بلکہ مکتوب الیہ کے لیے بھی مجلسی فضا تخلیق کرنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ ادب میں مرقع کشی کے لیے بڑے سلیقے اور ہنر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حقیقی جزئیات جو کسی منظر کی صورت حال کو اجاگر کر سکیں اور پھر ان جزئیات میں کہ کوئی بات زائد از ضرورت محسوس نہ ہو، بلکہ پر معمولی اور غیر معمولی چیز حسن ترتیب سے یکجا ہو کر ایک مجموعی کیفیت پیدا کر دے، ایک مرقعے کی بنیادی شرائط ہیں۔ مرقع کشی کے لیے تخیل سے زیادہ مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرقع وہی کامیاب ہوتا ہے جس میں خارجی ماحول کی خیالی باتیں نہ ہوں بلکہ حقیقی جزئیات ہوں۔ غالب کے خطوط میں منظر کشی اور مرقع نگاری اس لحاظ سے بڑی جاندار ہے کہ وہ ماحول کی خیالی تصویروں کے بجائے حقیقی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ وہ حسن انتخاب اور حسن ترتیب سے اپنے گرد و پیش کی جزئیات سے ایسے مرقع تیار کرتے ہیں کہ جنہیں بڑھ کر قاری اس ماحول کا پورا احساس کرنے اور محظوظ ہونے لگتا ہے۔

”میر مہدی صاحب! صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔

انگلیٹھی سامنے رکھی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا ہوں۔

آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں؟“ (۲۲)

غالب کی نثر کا ایک اور نمایاں پہلو شوخی و طرافت ہے۔ ان کے خطوط میں ظریفانہ غصہ کئی صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ بحیثیت مجموعی اُن کے ہاں طرافت کی شدید مٹھک صورتوں سے زیادہ شوخی اور ککتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ ان صورتوں کا تعلق بڑی حد تک لفظوں کے رد و بدل یا ان کے ایک سے زیادہ معنوں کے لطف انگیز استعمال سے ہے۔ زندگی کی مٹھکہ خیز بولچھیوں کو دکھانا ان کا مقصد نہیں۔ وہ محض اپنی طباعی اور ذہانت کے کرشمے دکھا کر مخاطب کو محظوظ کرنا چاہتے ہیں۔

غالب کی طرافت خطوں کی محدود فضا کے مطابق ہے۔ خطوں میں کئی پابندیوں کی وجہ سے اظہار کا دامن نسبتاً تنگ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے مخاطب ذی علم لوگ تھے اس لیے ان کی تحریروں میں وقار اور علیت کی پاسداری موجود ہے۔ وہ ہر حال میں ہر موقع پر اپنی شائستگی، تہذیب اور فضیلت کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی طرافت میں بھی بزرگانہ اور مشفقانہ انداز پیدا ہو گیا ہے۔ انہوں نے آنسوؤں اور قہقہوں میں زندہ رہنے اور زندگی کا احساس دلانے کی جو راہ تلاش کی، اس میں شوخی و طرافت کا عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ سرچشمہ غم سے پھوٹنے والی طرافت کوئی معمولی درجے کی طرافت نہیں ہوا کرتی۔ اس میں زندگی کی حقیقتیں اور زندگی کے تضادات سے پیدا ہونے والی بصیرتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس قسم کی طرافت کی تخلیق کے لیے دل گدازتہ ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک عظیم ذہن و فکر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب قلب و ذہن کے اعتبار سے اُس مقام پر تھے جہاں اس قسم کی طرافت کے چشمے پھوٹتے

ہیں۔ ان کا اجتماعی ماحول غم انگیز تھا۔ محفلیں ویران ہو گئی تھیں، احباب بچھڑ گئے تھے۔ موت کی گرم بازاری نے ہر طرف افسردگی اور بے رونقی پھیلا دی تھی۔ اس افسردہ ماحول میں بھی غالب نے خوش طبعی سے زندگی گزارنے کا جو ضابطہ حیات اپنایا، اس کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اپنے احباب کو بھی اس میں شریک کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ محفل میں بے رونقی کا کچھ تو مداوا ہو جائے۔ بعض اوقات غالب کی زندہ دلی تعزیت جیسے رقت آمیز موضوع کو بھی ظرافت کا عنوان بنا دیتی ہے اور غمزہ انسان میں صبر و ضبط کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً

”امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے

رُشک نظر آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں

کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا

گلے میں پڑا ہے، نہ پھندا ہی ٹوٹا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ

کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔“ (۲۳)

تعزیت کے علاوہ شکوے اور خفگی کے مواقع پر بھی وہ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی تنخی محسوس نہیں کرتا بلکہ محظوظ ہوتا ہے۔ شکوے میں غالب نے اپنی جدت طبع کی بدولت ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے مثلاً:

”فقیر شکوہ سے برا نہیں مانتا، مگر شکوہ کے فن کو سوا میرے کوئی نہیں جانتا۔

شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست منہ نہ موڑے اور معہذِ دوسرے کے۔

کیوں صاحب! یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا؟ اور

اگر دشوار تھا تو اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی شکایت نہیں کرتا،

پوچھتا ہوں کہ یہ امور متعصی شکایت ہیں یا نہیں؟“ (۲۴)

غالب کے خطوں میں لفظی نکتہ آفرینی کے علاوہ ظرافت کی چند اور صورتیں بھی ہیں۔ وہ کسی جگہ نقالی سے لطف پیدا کرتے ہیں مثلاً:

”وہ حسین علی خان جس کا روزمرہ ہے کھلونے منگوا دو میں بھی بجا جاؤں گا۔“ (۲۵)

الغرض غالب کے خطوط اردو ادب کے بہترین شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا انداز منفرد ہے، مرزا نے اردو نثر کو شخصیت سے روشناس کرتے ہوئے اس میں متانت کے ساتھ ساتھ سلاست اور سادگی پیدا کی۔ اردو میں سنجیدہ ظرافت اور طنز کی داغ بیل انہوں نے ڈالی۔ ان کے خطوط تاریخی، ادبی اور سوانحی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطوں میں دل پذیری، معنی گیری، تہذیبی مصوری، اور سیاسی و عصری عکاسی قابل ذکر ہے۔ اس وقت کے مسائل، حالات اور واقعات اور دوسری علمی و ادبی، اور سیاسی و سماجی باتوں کا ذکر غالب نے اس طرح کیا ہے کہ خطوط کو اپنے دور اور زمانے کا آئینہ دار ہی نہیں بنایا بلکہ اردو نثر میں اسے وہ درجہ دیا جہاں اردو کے بہت کم نثر نگار پہنچ سکے ہیں۔

حوالہ جات

- ۱۔ حامد حسن رضوی: تاریخ داستان اردو، آفیسٹ پرنٹرز، دہلی، ۱۹۳۸ء، ص ۲۸۱۔
- ۲۔ غلام رسول مہر، مولانا، خطوطِ غالب، (مرتبہ) مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۳۶۲۔
- ۳۔ محمد حیات خان سیال، پروفیسر، احوال و نقدِ غالب (مرتبہ)، نذر سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۵۸۔
- ۴۔ ایضاً
- ۵۔ ایضاً
- ۶۔ حامد حسن قادری، مولانا، غالب کی اردو نثر اور دوسرے مضامین، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۱۔
- ۷۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (مرتبہ)، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷۷۔
- ۸۔ ایضاً، ص ۱۸۹۔
- ۹۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔
- ۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، میرامن سے عبدالحق تک، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۲۹۔
- ۲۔ خلیق انجم: غالب کے خطوط، ص ۱۸۲۔
- ۳۔ شاداب تبسم، اردو مکتوب نگاری (سرسید اور ان کے رفقاء کے کار کے خصوصی حوالے سے)، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۳۱۱۔
- ۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، میرامن سے عبدالحق تک، ص ۲۸۔
- ۵۔ محمد حیات خان سیال، پروفیسر، احوال و نقدِ غالب (مرتبہ)، نذر سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۵۰۵۔
- ۶۔ غلام رسول مہر: خطوطِ غالب، ص ۳۱۲۔
- ۷۔ شاداب تبسم، اردو مکتوب نگاری (سرسید اور ان کے رفقاء کے کار کے خصوصی حوالے سے)، ص ۱۳۶۔
- ۸۔ حامد مسعود، خطوطِ غالب، فنی تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۔
- ۹۔ ضیاء الرحمن، ڈاکٹر، اسالیب نثر پر ایک نظر (مرتبہ)، بکشمی پریس دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۰۔
- ۲۰۔ محمد حیات خان سیال: احوال و نقدِ غالب، ص ۳۵۵۔
- ۲۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، جہی سے عبدالحق تک، نارپبلشنگ ہاؤس دہلی، سن ۹۷۔
- ۲۲۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط (مرتبہ)، ص ۲۶۱۔
- ۲۳۔ حامد حسن قادری: غالب کی اردو نثر اور دوسرے مضامین، ص ۲۳۴۔
- ۲۴۔ محمد حیات خان سیال: احوال و نقدِ غالب، ص ۳۵۵۔
- ۲۵۔ ضیاء الرحمن، ڈاکٹر، اسالیب نثر پر ایک نظر (مرتبہ)، ص ۱۵۳۔